اداریہ

عدل وانصاف کا قیام اور انسانی وقار کا تحفظ

ادہر ایک عرصے سے پاکستان کے اربابِ سیاست کو بھی اس بات کا شدت سے احساس ہوگیا ہے کہ پاکستان ایک صحت مند سیاسی، اجتماعی اور معاشی نظام کو قائم کرنے میں ابھی تک کامیاب نہیں ہوا، جس کی وجہ سے اہلِ پاکستان کی ایک بڑی تعداد ایک باوقار زندگی بسر کرنے کی سکت نہیں رکھتی۔ زندگی ان کے لیے ایک بوجھ بن گئی ہے۔ ان کے بچے پڑھنے کی بجائے کہیں مزدوری کرتے ہیں۔ اگر کام نہیں ملتا تو اپنے بوڑھے ماں باپ کے ساتھ بھیک مانگتے پھر رہے ہیں، جس سے ہمارے بھیانک سماجی نظام کا پتہ چلتا ہے۔

بے شبہ مادی مشکلات کے ہاتھوں انسانی زندگی کی رسوائی تاریخ کا کوئی نیا واقعہ نہیں ہے۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ اربابِ ہمت کے جوہر بھی ایسے ہی نازک وقت میں کھلتے ہیں، جب وہ اپنی سماج کی تقدیر بدلنے کے لیے میدانِ عمل میں اُترتے ہیں اور اپنی 'دیوانگی' سے اپنے بیمار معاشروں کو غربت، رشوت، بدنظمی اور ظلم وستم سے نجات دِلاتے ہیں۔ آج ہماری سماجی زندگی کے مسائل میں سے ایک مسئلہ یہ ہے کہ ہمارے عوام الناس کے لیے عدالت کے دروازے تک پہنچنا دشوار ہوگیا ہے۔ حصولِ انصاف کے لیے انہیں دِنوں، ہفتوں اور مہینوں کی بجائے سالوں تک انتظار کرنا پڑتا ہے، اور یہ کہنا مشکل ہے کہ کتنے لوگ ہیں جو منزل تک پہنچنے سے پہلے ہی راہ ہی میں دم توڑ دیتے ہیں۔ زندگی کی اس تلخ حقیقت پر ہمارے اہلِ دانش بار بار لکھ چکے ہیں کہ حصولِ انصاف کی راہ میں ایک بڑی رکاوٹ یہ ہے کہ جھوٹی گواہیوں کا کاروبار بڑے وسیع پیمانے پر ہو رہا ہے۔ جس کی وجہ سے انصاف کا حصول مشکل سے مشکل تر ہوتا جا رہا ہے۔ نیز عدالتی نظام سے وابستہ لوگوں کی ایک بڑی تعداد اخلاقی ذمہ داری کا گہرا شعور نہیں

رکھتی۔ چنانچہ جو مقدمہ ہمارے ہاں سالوں تک چلتا ہے، اسی مقدمہ کا فیصلہ ترقی یافتہ قوموں میں چند مہینوں میں ہو جاتا ہے۔

تاریخ کی یہ ستم ظریفی بھی دیدنی ہے کہ مسلم قومیں، جن کے اجتماعی اور اخلاقی فلسفے میں عدل و انصاف کا نظریہ ہمیشہ مرکزی کردار ادا کرتا رہا ہے۔ اپنے اس ملی اور قومی شعار (قیامِ عدل) سے غفلت برت رہی ہیں۔ حالانکہ وہ یہ عقیدہ رکھتی ہیں کہ ایک عارف و زاہد کی زندگی بھر کی عبادت سے ایک انصاف پسند حکمران کے ہاتھوں ایک مظلوم بڑھیا کی داد رسی کا کارنامہ زیادہ وزن رکھتا ہے۔ قرآنِ مجید نے عدل کی آفاقی عظمت کی طرف توجہ دِلاتے ہوئے مسلمانوں سے کہا ہے: ''دیکھنا! کسی قوم کی دشمنی تمہیں اس بات پر نہ اکسائے کہ تمہارے قدم راہِ عدل سے ہٹ جائیں۔''(۱) یہی وجہ ہے کہ اہلِ وفا نے کبھی بھی اس ننگ کو قبول نہیں کیا کہ ان کا تعلق کسی عنوان سے ظلم سے تھا، حتیٰ کہ بیسویں صدی میں جب مسلم قومیں اپنی تن آسانی کی وجہ سے مغربی قوموں کے مقابلے میں زندگی کی دَوڑ میں پیچھے رہ گئی تھیں، اپنے دشمنوں کے ساتھ برابر عدل و انصاف اور حسنِ سلوک کا معاملہ کرتی رہیں۔ برطانیہ میں شاہی خاندان کے ایک انگریز قانونی مشیر نے جو بیسویں صدی کی پہلی جنگِ عظیم سے قبل استانبول میں سلطان کے دربار میں رہتا تھا، ایک ترک افسر سے کہا: ''میں (لندن کی) ایک سرکاری میٹنگ میں مشرقی اُمور سے متعلق مشیر کی حیثیت سے بیٹھا تھا کہ برطانوی وزیرِ دفاع نے برطانوی وزیرِ اعظم کے سامنے چند برقی پیغامات رکھے، جنہیں پڑھنے کے بعد وزیرِ اعظم نے کہا، حضرات! میں اس بات کو سمجھنے سے قاصر ہوں کہ ہم تہذیب یافتہ قومیں جنگ کے زمانہ میں وحشی درندے کیوں بن جاتی ہیں؟ عراق میں ہمارے فوجی کمانڈر نے یہ خطوط بھیجے ہیں۔ جن میں کہا گیا ہے کہ ترکی میں ہمارے فوجی قیدیوں کے ساتھ ترکوں کا برتاؤ بہت اچھا ہے اور وہ ہمارے قیدیوں کے آرام کا ہرممکن خیال رکھتے ہیں۔ مجھے علم نہیں کہ آخر وہ کون سے عوامل ہیں، جو ان ترکوں کو اس حسنِ سلوک کے لیے مجبور کر رہے ہیں۔'' برطانوی وزیرِ اعظم کے اس بیان پر برطانوی وزیرِ جنگ

(۱) لایجرمنکم شنان قوم ان لا تعدلوا۔ (المائدہ:۸)

نے کہا کہ میں خود بھی حیرت میں ہوں کہ برطانوی قیدیوں کے ساتھ ترکوں کا یہ حسنِ سلوک کیوں ہے؟ عجیب بات یہ ہے کہ انگریز قیدیوں کے ساتھ زخمی جرمن قیدی بھی تھے۔ جونہی ان جرمن قیدیوں نے انگریز قیدیوں کو دیکھا تو وہ ان پر ٹوٹ پڑے، جنہیں (انگریز قیدی) ترک سپاہیوں نے بچایا۔

اس گفتگو میں ایک انگریز افسر نے استانبول کے سلطانی دربار میں رہنے والے انگریز مشیر سے پوچھا کہ آخر تم ہی بتاؤ کہ برطانوی فوجی قیدیوں کے ساتھ ترکوں کے اس حسنِ سلوک کی وجہ کیا ہے؟ انگریز مشیر نے کہا: ہم اہلِ یورپ تقریباً دوسو سال سے ترقی یافتہ قوانین پر عمل کر رہے ہیں لیکن اسلام نے تو ادھر ایک ہزار سال پہلے اپنے سپاہیوں کو یہی حکم (دشمن سپاہیوں سے حسنِ سلوک) دیا تھا اور کہا تھا کہ یہ ''خدائی حکم'' ہے۔ چنانچہ آج یہ قانون (دشمن سے حسنِ سلوک) ان کے مزاج کا ایک حصہ بن گیا ہے۔(۱)

سلطان محمد الثانی کے فاضل مصنف نے مزید لکھا ہے کہ

۱۔ جنگی قیدیوں کو قتل نہیں کیا جائے گا۔

۲۔ بچوں، مریض، بوڑھے، جو جنگ میں حصہ لینے کے اہل نہیں، ایسے ہی خواتین اور مذہبی لوگ (پادری) بوقتِ معاہدہ جزیہ کی ادائیگی سے آزاد اور مستثنیٰ ہوں گے۔

الغرض، مسلم معاشرے کا ایک بنیادی اور ملی نشان عدل و انصاف کا قیام رہا ہے۔ لیکن آج گردشِ دوراں کے ہاتھوں ہم اپنے آپ کو بھول گئے ہیں۔ ہمیں شوکت عزیز انتظامیہ سے اُمید ہے کہ وہ ایک ٹھوس اور مربوط معاشی منصوبہ کے تحت غریبوں، کسانوں اور محنت کشوں کے معاشی مسائل حل کرنے میں کامیاب رہے گی۔ جاگیردارانہ کلچر اور اخلاقی فساد (Moral Corruption) سے نجات حاصل کیے بغیر قومی وقار کو بحال نہیں کیا جا سکتا۔ تعلیم، صحت اور بڑھاپے کے مسائل (Old Age Problems) کے حل کے لیے ہم مغرب اور مشرق کی فلاحی

(۱) ملاحظہ ہو: علی ہمت برکی الافکتی کی کتاب ''سلطان محمد الثانی (فاتح قسطنطنیہ) اور ان کی عادلانہ زندگی، قاہرہ، ۱۹۵۳ء، (ط۔السعادۃ)، ص (۱۳۱-۱۳۳)

ریاستوں کے تجربوں سے فائدہ اُٹھا سکتے ہیں۔ ۱۹۷۸ء کی فوجی حکومت نے زکاۃ کو سرکاری سطح پر وصول اور تقسیم کرنے کا صحیح فیصلہ کیا تھا۔ اگر نظامِ زکاۃ کو صحیح خطوط پر منظم کیا جائے اور اہل، تجربہ کار اور دیانت دار لوگوں کو آزادی سے کام کرنے کا موقع دیا جائے تو یہ شعبہ عوام کی فلاح و بہبود کے لیے بڑی خدمات سرانجام دے سکتا ہے۔

گزشتہ دنوں کراچی کے ایک ایڈووکیٹ سیّد فیروز شاہ نے روزنامہ جنگ کے فاضل مدیر جناب ارشاد احمد حقانی کے نام اپنے ایک خط میں عدل و انصاف کے قیام میں ہماری بدعنوانیوں اور برطانوی معاشرے میں عدل و انصاف کے حصول میں کی جانے والی منظم اجتماعی کوششوں کا تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ ہم اس مکتوبِ گرامی کو بہ شکریہ روزنامہ جنگ (مورخہ ۱۷ر جون ۲۰۰۴، ص ٦)، نقل کر رہے ہیں۔ [ایڈیٹر]

''نظامِ انصاف کی خامیاں — یہ ہیں اصلاحی تجاویز''

''آپ نے ایک سے زیادہ بار اپنے کالموں میں پاکستانی جیلوں کی حالتِ زار اور وہاں قیدیوں کے بے پناہ مصائب پر بڑی درد مندی سے لکھا ہے اور وہاں قید کچھ لوگوں کے تاثرات کو بھی پیش کیا ہے۔ پاکستان کی تمام جیلوں میں اوسطاً دو تہائی سے زیادہ تعداد ان قیدیوں کی ہے جو سزایافتہ نہیں ہیں۔ ان کے معاملات سالہا سال سے عدالتوں میں معرضِ التوا میں پڑے ہوئے ہیں۔ جیلوں میں گنجائش سے تین چار گنا زیادہ تعداد میں قیدی جانوروں سے بھی بدتر زندگی گزارنے پر مجبور ہیں۔ اُن کی یہ حالت پوری قوم کے لیے باعثِ شرم ہے۔ میں نے اور میرے ساتھیوں نے تحریکِ عدل کے تحت کئی قیدیوں کو مفت قانونی امداد فراہم کی ہے۔ اکثر قیدی شدید غربت اور بے سروسامانی کی وجہ سے اپنی ضمانت تک نہیں کرا سکتے۔ ایسا ایک شخص جو ہماری مدد سے بری ہوا نو سال تک جیل میں قید رہا، حالانکہ وہ مقدمے کے فیصلے پر باعزت بری ہو گیا تھا۔ لیکن اس دوران اس کی زندگی کے قیمتی نو سال ضائع ہو گئے۔ ایسی کئی

مثالیں ہیں جن کی تعداد ہزاروں تک پہنچتی ہے۔غریب قیدیوں کو اس لیے بھی عدالتوں تک نہیں لے جایا جاتا کہ وہ متعلقہ اہلکاروں کو رشوت نہیں دے سکتے۔ کیا اسلام جو آئینی طور پر ہماری مملکت کا سرکاری مذہب ہے، ایسے شرمناک نظام کی اجازت دیتا ہے۔ ہمارے منتخب نمائندے جیلوں کے علاوہ دیگر مسائل پر ایسے قوانین اور طریقے وضع کرنے سے کیوں قاصر رہتے ہیں، جن کے ذریعے غریبوں کو انصاف مل سکے اور ملک میں فلاحی معاشرے کا قیام ممکن ہو سکے؟ جیلوں میں قیدیوں کی بھرمار اس لیے ہے کہ ملک میں عدالتی فیصلے تاخیر سے ہوتے ہیں۔ انگلستان میں مقدمات کے عدالتی فیصلے چار ماہ سے زیادہ عرصے میں ہوں تو اسے قومی ندامت کا معاملہ (National Shame) سمجھا جاتا ہے۔ وہاں فوجداری مقدمات ۹۷ فیصد کی حد تک مقامی مجسٹریٹ کورٹوں میں طے ہوتے ہیں اور بالعموم چند ہفتوں میں طے پا جاتے ہیں۔ مجسٹریٹوں کی اکثریت رضا کار مجسٹریٹوں (Lay Magistrates) پر مشتمل ہوتی ہے۔ یہ لوگ عام طور پر قانون دان نہیں ہوتے۔ یہ مجسٹریٹ مقدمات کا فیصلہ اپنی عقل وفہم کے ساتھ ساتھ مقامی حالات سے واقفیت کی بنیاد پر کرتے ہیں۔ عام طور پر دو مجسٹریٹ اور کاؤنٹی کلرک ساتھ بیٹھ کر مقدمات سنتے ہیں اور ایک دو پیشیوں میں فیصلہ ہو جاتا ہے۔ انگلستان میں رضا کار اور تنخواہ دار مجسٹریٹوں کا تقرر مجسٹریٹس کورٹ کمیٹی (Magistrates Court Committee) کرتی ہے جو مقامی منتخب کونسلروں پر مشتمل ہوتی ہے۔ یہ ضروری ہوتا ہے کہ مجسٹریٹ بننے کا اُمیدوار اس کاؤنٹی (ضلع) کی حدود کے پندرہ میل کے اندر کا رہائشی ہو۔ چونکہ وہاں مقامی عدالتیں عوام کی مرضی اور مدد سے تشکیل پاتی ہیں، اس لیے عوام کو بھی ان پر بھرپور اعتماد ہوتا ہے۔ چنانچہ ہر دس ملزمان میں سے سات ملزم اپنا جرم تسلیم کر لیتے ہیں۔ ایسی صورت میں ان کی سزا میں خاصی نرمی کر دی جاتی ہے۔ اس وقت انگلستان میں رضا کار (Lay) مجسٹریٹوں کی تعداد تیس ہزار کے قریب ہے۔ وہاں ملک بھر میں ۶۵۰ مجسٹریٹ کورٹ عدالتیں ہیں۔ ان میں سے ۴۵۰ عدالتیں دیہاتی علاقوں میں کام کر رہی ہیں تا کہ عوام کو ان کے گھر کے نزدیک انصاف مل سکے۔ سر تھامس سکرمے (Skyrme) کے الفاظ میں ایسی عدالتوں کو اس طرح بیان کیا گیا ہے:

"The system enables the citizen to see that the law is his law, administered by men and women like him and that it is not the esoteric presence of lawyers."

مجسٹریٹوں سے اوپر برطانیہ میں کراؤن کورٹ (ہمارے ہاں سیشن جج) عدالتیں ہر سال اوسطاً ایک لاکھ پچیس ہزار مقدمات نمٹاتی ہیں۔ یہاں زیادہ سنگین مقدمات جیوری کے ذریعے طے ہوتے ہیں جو چند مہینوں میں فیصل ہو جاتے ہیں۔

امریکہ میں کسی ملزم کے خلاف ۱۸۰ دِنوں کے اندر مقدمے کا فیصلہ نہیں ہوتا تو وہ خود بخود بری تصور کیا جاتا ہے۔ وہاں چھٹی آئینی ترمیم کے ذریعے تیز رفتار اور کھلے عام ٹرائل کو عوام کے بنیادی حقوق میں شامل کر دیا گیا تھا۔ میں نے کچھ عرصہ قبل امریکی شہر Pittsburg میں متعدد فوجداری مقدمات کی کارروائی دیکھی۔ وہاں ملزم کو کسی کٹہرے میں کھڑا نہیں کیا جاتا، وہ ایک آرام دہ کرسی پر بیٹھے بیٹھے وکیلوں اور عدالت کے سوالوں کا جواب دیتا ہے۔ عدالت میں پولیس اہلکار ملزم کو سر (Sir) کہہ کر مخاطب کرتے ہیں۔ امریکہ میں پانچویں آئینی ترمیم کے ذریعے ہر ملزم کو یہ حق ودیعت کر دیا گیا تھا کہ اس کا کیس بارہ غیر جانبدار شہری بطور جیوری (Jury) فیصلہ کریں۔ حقائق (Points of fact) پر جج جیوری کے فیصلے کا پابند ہوتا ہے۔ جیوری کے ذریعے فوجداری مقدمات بہت کم وقت میں مکمل ہو جاتے ہیں۔ اس طریقے سے بھی جیلوں میں قیدیوں کی تعداد بڑی حد تک کم ہو سکتی ہے۔ جیوری کے ذریعے عدلیہ میں کرپشن بھی ختم ہو جاتی ہے۔

پاکستان میں ہر کوئی جمہوریت کی بات کرتا ہے، لیکن کیا ہمارے ملک میں جمہوریت نے عوامی مسائل میں کمی کے لیے کوئی رول ادا کیا ہے؟ ہمارے ہاں یہ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ یہاں پارلیمانی جمہوریت کا نظام ہے، لیکن حقیقت میں ایسا نہیں ہے۔ آیئے دیکھتے ہیں کہ پارلیمانی جمہوریت کی ماں انگلستان میں وہاں کی پارلیمنٹ کس طرح عوامی مسائل کے حل کے لیے کام کرتی ہے اور ممبرانِ پارلیمنٹ اپنے فرائض کس طرح ادا کرتے ہیں۔ ان کی توانائیاں اور وقت کس طرح خرچ ہوتا ہے؟ اس کی تفصیل یوں ہے۔ ممبران کا ۲۸ فیصد وقت پارلیمنٹ کی

کمیٹیوں کی میٹنگوں میں صرف ہوتا ہے۔ ان کا ۲۴ فیصد میٹنگوں کی تیاری کے سلسلے میں ریسرچ اورعوامی حلقوں سے معلومات اکٹھا کرنے میں لگتا ہے۔ ان کا ۱۸ فیصد وقت عام ووٹر کے مسائل حل کرنے سے متعلق ہوتا ہے۔ ہرممبر اپنے حلقے کے لوگوں کے خطوط کا جواب دینے کا پابند ہوتا ہے۔ جواب میں وہ متعلقہ محکمے سے معلومات حاصل کر کے ووٹر کو پہنچاتا ہے۔ ایک ممبر کا اوسطاً ۱۱ فیصد وقت پارلیمنٹ سے باہر اداروں میں شرکت کر کے کام کرنے میں خرچ ہوتا ہے۔ اس کا ۹ فیصد وقت سفر اور پارلیمنٹ سے باہر میٹنگوں میں صرف ہوتا ہے۔ اس کا ۷ فیصد وقت سیاسی پارٹی کے اجلاسوں میں شرکت کرنے پر خرچ ہوتا ہے۔ ۳ فیصد وقت عوام سے صلاح ومشورے میں خرچ ہوتا ہے۔ کیا پاکستان میں ہمارے ممبران اوپر بیان کردہ کام کرتے نظر آتے ہیں؟ اس کا جواب نفی میں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عوامی مسائل میں روز بروز اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ البتہ ممبران کی مالی حالت بہتر سے بہتر ہوتی رہتی ہے۔ اس صورتحال کا علاج عوامی شعور میں اضافہ اور آئینی اصلاحات میں ہی مضمر ہے۔ اگر موجودہ سیاسی نظام اسی طرح چلتا رہا تو عوام جمہوریت ہی سے ناامید ہو جائیں گے۔ وہ جمہوریت کے نام پر سالہاسال سے دھوکے کھا رہے ہیں۔''

آپ کا مخلص

سیّد فیروز شاہ، ایڈووکیٹ (کراچی)

سیّد فیروز شاہ صاحب نے برطانیہ یا امریکہ کے نظامِ عدل پر جس تفصیل سے لکھا ہے، اس سے ہم بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ ہمیں گاہے گاہے آئینۂ روزگار میں اپنی تصویر ضرور دیکھ لینی چاہیے۔ شاید اس طریق سے ہم اپنا سراغ پاسکیں۔ قرآنِ مجید میں آیا ہے ''تم ان لوگوں جیسے نہ ہو جانا، جو خدا کو بھول گئے۔ (پاداشِ عمل میں) خدا نے انہیں ایسا کر دیا کہ وہ اپنے آپ کو بھول گئے۔ یہی لوگ بدکردار ہیں۔'' (الحشر:۱۹)(۱)

حقیقت یہ ہے کہ جب زندگی کا رشتہ سچائی سے ٹوٹ جاتا ہے تو پھر زندگی بہ قول رومیؒ شرمندگی میں بدل جاتی ہے۔ چنانچہ ہمیں مندرجہ بالا خط کی روشنی میں اپنا جائزہ لینا چاہیے۔ کیا

(۱) لاتکونوا کالذین نسوا اللہ فانسا ھم انفسھم، اولئک ھم الفاسقون۔

ترقی یافتہ ملکوں کے نظامِ عدل کی طرح ہمارے مقدمات کا فیصلہ بھی چند مہینوں میں ہوتا ہے؟ کیا ہمارے قومی نمائندے بھی اپنے حلقے کے لوگوں سے پوچھتے ہیں کہ انہیں حصولِ انصاف کی راہ میں کیا کیا دشواریاں پیش آتی ہیں؟ اگر ہمارے قومی نمائندوں کا اپنے ہی حلقے کے شہریوں سے قریبی رشتہ ہوتا، تو ان کی زندگی کے قیمتی سال عدالتوں کے طریقِ کار کی نذر نہ ہوتے۔ ہماری اجتماعی زندگی میں عام لوگ جن مشکلات کا شکار ہیں، ان پر اربابِ دانش بہت کچھ لکھ چکے ہیں۔

آج سے کئی سال پہلے ایک امریکی پروفیسر جے، مورگنتھن (J.Morgenthan) نے لکھا تھا:
''پاکستان کے مستقبل کو یقینی بنانے کے لیے کوئی حل ہے تو وہ ہے غیر معمولی حکمت (Extraordinary Wisdom) اور سیاسی مہارت (Political Skill)۔ افسوس یہ دونوں باتیں (غیر معمولی حکمت و دانائی اور سیاسی بصیرت) کراچی (اس وقت کراچی ہمارا صدر مقام تھا) کے سیاست دانوں میں نہیں پائی جاتیں۔'' ۱۹۵۴ء سے لے کر ۱۹۷۱ء تک پاکستان کی سیاست جس راہ پر چلی ہے، اور اس کے جو خوف ناک نتائج برآمد ہوئے ہیں، اس نے بتا دیا ہے کہ پروفیسر موصوف 'دیدۂ بینا' رکھتے ہیں۔

یہ عجیب 'سوءِ اتفاق' ہے کہ پروفیسر موصوف نے ۱۹۵۶ء میں ہمارے اہلِ سیاست کے بارے میں جو کچھ کہا تھا، وہی بات کہ پاکستان کا مستقبل غیر یقینی ہے، اکیسویں صدی کے آغاز میں ایک دوسرے پروفیسر سٹیفن کوہن (Stephen Cohen) نے کہی ہے۔

چنانچہ ہماری اجتماعی زندگی کا تقاضا ہے کہ شوکت عزیز انتظامیہ اپنے اخلاص، دیانت، بصیرت اور عملِ پیہم ہی سے ہماری کشتی کو بادِ مخالف کے تھپیڑوں سے بچا کر منزل تک پہنچ سکتی ہے۔

الغرض اگر ہم اخلاص سے اپنے معاشی، جمہوری اور عدالتی مسائل کو ان کے صحیح تناظر میں دیکھیں اور صبر و تحمل اور حکمت و بصیرت کا ساتھ نہ چھوڑیں تو ہم ان مسائل کو بڑی خوش اسلوبی سے حل کر سکتے ہیں۔ مبہم مذہبی نعرے، آتشیں تقریریں اور مظاہرے نہ پہلے مسائل حل کر سکے ہیں اور نہ آئندہ کر سکیں گے۔ ع: بضاعت سخن آخر شد و سخن باقیست

رشید احمد (جالندھری)